# حیاتِ جلالیؒ

(حضرت مولانا سیّد عبداللہ اکم صاحب جلالیؒ کی
علمی و دینی خدمات اور خاندانی حالات پر دو مقالے)

ناشر

جلالی اکیڈمی دہلی ۶

(جملہ حقوق محفوظ)

سنہ اشاعت ——— ۱۹۸۶ء
تعداد ——— ایک ہزار
ناشر ——— جلالی اکیڈمی دہلی
کاتب ——— محمد نذیر الدین ذکیؔ
مطبع ——— جے. کے آفسیٹ پریس دہلی

## ملنے کا پتہ

۱- نجم کلینک ۱۰۳۶ گلی مدرسہ حسین بخش جامع مسجد دہلی ۶
۲- محمد نظر علیخاں بی ۳۹ حضرت نظام الدین ویسٹ. نئی دہلی ۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

## پیش لفظ

قبلہ والد ماجد حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر دہلی و رام پور وغیرہ میں متعدد تعزیتی جلسے ہوئے جن میں آپ کی زبردست دینی و علمی خدمات کو تحریری و تقریری طور پر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

دو مقالے، جن میں مولانا مرحوم کی علمی زندگی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے نیز آپ کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، شائع کیے جا رہے ہیں۔ پہلا مقالہ مولانا مرحوم کے نہایت عزیز و لائق شاگرد جناب مولانا محمد نظر علی خانصاحب (عرف محمد میاں) رامپوری سکریٹری سفارت خانہ کویت نئی دہلی کا ہے۔ جس میں موصوف نے اپنے استاد کے علمی کارناموں اور ان کی تمام تصانیف کا ذکر مبصرانہ انداز سے کیا ہے۔ علاوہ ازیں مقالے کے شروع میں اختصار کے ساتھ علمائے رامپور کا تعارف و تذکرہ بھی ہے، یہ مقالہ بتاریخ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۳ء بمقام غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں پڑھا گیا تھا، اور مولانا کے منتسبین و دہلی کے دانشوروں کی طرف سے مقالے کی کافی پذیرائی ہوئی تھی۔ اسی تعزیتی جلسے میں جناب سید اوصاف علی صاحب ڈائرکٹر اسلامک انسٹی ٹیوٹ ہمدرد نگر تغلق آباد نئی دہلی نے اپنی پر مغز تقریر میں یہ فرماتے ہوئے کہ میں رامپور کے دو بزرگ علماء سے کافی متاثر ہوا ہوں ایک مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی مرحوم اور دوسرے مولانا سیّد عبدالدائم صاحب جلالی۔ مولانا کا یہ قول بھی نقل کیا تھا کہ "میں اب تک تقریباً تیس ہزار صفحات لکھ چکا ہوں۔"

دوسرا مقالہ مولانا مرحوم کے قریبی رشتہ دار اور لائق شاگرد جناب مولوی سید بہار الحق صاحب رضوی ایڈوکیٹ وصدر صولت پبلک لائبریری رامپور کا تحریر کردہ ہے۔ اس مقالے میں بھی مولانا کی تمام کتابوں کا ذکر ہے سنین کے ساتھ، نیز مولانا کے افکار و خیالات کے ساتھ مرحوم کے خاندان کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے یہ مقالہ صولت پبلک لائبریری رام پور میں پڑھا گیا تھا۔ فجزاھما اللہ خیر الجزاء

صرف ایک جملہ حضرت قبلہ والد ماجدؒ کے متعلق عرض کروں گا، علم و فضل اور سادگی میں نے اپنے والد جیسی یکجا کسی عالم میں نہیں دیکھی۔

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ متعدد تراجم کتب احادیث جن میں مترجم کا نام مولانا سید عبد الدائم جلالی تحریر ہے، اختلافِ ترجمہ کے ساتھ اور بے اجازتِ مولانا و ورثاءِ مولانا بازار میں فروخت ہو رہے ہیں، اور کچھ کتبِ احادیث مترجمہ مولانا سید عبد الدائم صاحب جلالی و تفسیر کلام اللہ (بیان السبحان) جو بازار میں دستیاب ہو رہی ہیں طباعت کے اعتبار سے نہایت ناقص ہیں کہ بعض صفحات پڑھے ہی نہیں جاتے۔

میرے لیے بحیثیت وارثِ مولانا نہایت ضروری ہے کہ والد مرحوم کے تراجم کتبِ احادیث علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، و تفسیر قرآن کریم بیان السبحان التزام صحت کے ساتھ منظرِ عام پر لانے کے لیے طباعت و اشاعت کا اہتمام کروں، دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس نیک ارادے میں کامیاب فرمائے، آمین۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللہ

ڈاکٹر سید نجم السلام
خلف اکبر مولانا سید عبد الدائم جلالیؒ
نجم کلینک، گلی مدرسہ حسین بخش، مٹیا محل
جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

جناب مولانا محمد نظر علی خانصاحب رامپوری
سفارت خانہ کویت نئی دہلی

نابغۂ عصر، مفسرِ قرآن، استاذی علامہ سید عبد الدائم جلالی کی وفات حسرت آیات (۵ نومبر ۱۹۸۳ء) پر یہ مقالہ سپردِ قلم کیا گیا۔
اور ۱۶ دسمبر ۱۹۸۳ء کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں پڑھا گیا۔)

مولانا سید عبد الدائم صاحب جلالی مرحوم سنہ ۱۹۰۱ء میں رام پور میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کی اور رام پور ہی کی قدیم و عظیم علمی درسگاہ مدرسہ عالیہ میں تقریباً ۲۵ سال مدرس و پرنسپل رہے۔

مصطفیٰ آباد عرف رامپور، پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی، لیکن علم و فضل کے اعتبار سے ایک قد آور شہر تھا، اور ایک زمانہ میں بخارائے ہند کے نام سے مشہور تھا، یہ عظیم خطہ علماء، وشعراء، اطباء، وصوفیاء اور عظیم سیاسی لیڈروں کا مولد و مسکن رہا ہے۔

۱۷۷۴ء میں نواب فیض اللہ خاں بہادر، ریاست رامپور کے پہلے فرمانروا نے رامپور کی شہرہ آفاق درسگاہ مدرسہ عالیہ کی بنیاد رکھی اور علامۂ عصر محقق زمانہ مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی فرزند مولانا نظام الدین سہالوی مؤسس درس نظامی کو اس عظیم علمی درسگاہ کا پرنسپل مقرر کیا۔ اور مشہور منطقی و فلسفی ملا حسنؒ جن کی شہرۂ آفاق منطق کی کتاب "ملا حسن" جو ہند و پاک کی ہر بڑی درس گاہ میں داخل نصاب ہے، مدرسہ عالیہ رام پور میں مدرس رہے اور رام پور ہی میں پیوند خاک ہوئے۔

اولیاء اللہ میں مقتدائے مشائخ حضرت عبداللہ شاہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، اور مشہور بزرگ حافظ شاہ جمال الدین علیہ الرحمۃ نے بھی رام پور ہی کو اپنا مسکن بنایا اور ہر دو بزرگوں کی آخری آرامگاہ بھی رام پور ہی ہے۔ اول الذکر بزرگ کے بغداد سے دہلی پہنچنے پر مشہور نقشبندی و مجددی بزرگ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مجدد حضرت مولانا فخر الدینؒ نے موصوف کی پالکی کو کندھا دیا تھا۔

شیخ شیوخ العالم امام الصوفیاء شاہ احمد سعید مجددیؒ کا وطن بھی رامپور ہی ہے، جن کے مریدین و خلفاء میں عرب و عجم کے نامور علماء و مشائخ شامل تھے۔

امام منطق و فلسفہ، مجاہدِ آزادیٔ ہند علامہ فضلِ حق خیر آبادی، اور ان کے صاحبزادے بو علی سینائے وقت، علماء منطق و فلسفہ کے استادِ اعظم علامہ عبدالحق خیر آبادی، جن کی وفات پر جامعہ ازہر مصر میں کئی روز کی تعطیل کر دی گئی تھی، اور جن کی کتابیں ان کی حیات ہی میں داخلِ نصاب ہند و مصر ہو گئی تھیں، اسی مدرسہ عالیہ رامپور میں مدّت مدید تک پرنسپل رہے۔

اور اسی بخارائے ہند کی خاک پاک سے عظیم محدث میاں محمد شاہ صاحبؒ استاد مولانا ابوالکلام آزاد و علامہ شبلی نعمانیؒ، اور میاں صاحب کے والد بزرگوار حسن شاہ صاحب محدثؒ پیدا ہوئے۔

بو علی سینائے ہند حکیم اعظم خاں رامپوری کی عظیم طبی تصانیف، اور مشہور مورخ مولوی نجم الغنی خاں صاحب کی عظیم علمی تصانیف کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آخر الذکر سے دوران گفتگو مصوّرِ فطرت شمس العلماء خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا کہ مولانا میری مصنفات کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے (اس وقت غالباً خواجہ صاحب کی مصنفات کی تعداد ڈیڑھ سو ہی ہو گی) لیکن آپ کی ایک ہی کتاب میری تمام کتابوں سے زیادہ ضخیم ہے۔

مورخ اعظم علامہ شبلی نعمانیؒ اور موجودہ صدی کے ہند و پاک کے سب سے بڑے عربی زبان و ادب کے ماہر علامہ عبدالعزیز میمن نے بھی اسی مدینۃ العلوم رامپور کے مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور یہیں مشہور عالم مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ نے علامہ عبدالعلی ریاضی داں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔

طبقۂ شعراء میں مشہور شاعر قائم چاندپوری اور بقول مولانا عرشی مرحوم ثم رامپوری کا مسکن و مدفن رام پور ہی تھا جگت استاد داغ دہلوی اور عظیم شاعر امیر مینائی کے مدت تک یہاں رہنے کی وجہ سے،

رام پور کو شاعری کے ایک تیسرے دبستان ہونے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

نظام رامپوری کی حسین غزلوں اور شیخ علی بخش بیمار رامپوری کی شاعری کو اردو زبان فراموش نہیں کرسکتی۔ اور مرزا غالب کا تذکرہ رام پور سے تعلق کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔

اور اس آخری دور انحطاط و زوال میں بھی مولانا محمد علی جیسا عظیم سیاست داں اور مرد مجاہد جس کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، اور عظیم و مشہور عالم و ادیب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی مرحوم بھی رامپور ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں علمی میدان میں چلنا اور دوڑنا سیکھا۔

علماء رامپور کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر موجودہ دور کی تین نامور اور باکمال ہستیوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ یعنی استاذ العلماء مولانا عبد الوہاب خانصاحب جو ایک جلیل القدر محدث، ممتاز فقیہ حق گو عالم دین، بیباک وجری اور کامیاب سیاستداں تھے۔

دوسرے مشہور عالم دین، بزرگ رہنمائے ملت جن سے اہل رامپور بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے ہیں، استاذ العلماء خطیب اعظم مولانا وجیہہ الدین احمد خانصاحب ہیں جو جامع معقولات و منقولات ہیں۔ اس دور قحط الرجال میں تدریس علوم اسلامیہ (معقول ومنقول) میں آپ ہی اپنی نظیر ہیں۔ آپکا اہم کارنامہ آپکے تلامذہ کی ایک ایسی جماعت ہے جو مدرس و واعظ بھی ہے اور صاحب افتا بھی۔ آپ کا دوسرا کارنامہ بشکل مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ رام پور ہے۔

تیسرے بلند پایہ عالم و مفکر مولانا عبد السلام خانصاحب ہیں۔ آپ جدید وقدیم فلسفے کے ماہر ہیں اور تصوف پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ کے تبحر علمی کا ثبوت ہندوستان کے قدیم فلسفے پر آپ کے عربی مضامین ہیں جو مشہور سہ ماہی مجلہ "ثقافۃ الہند" میں چھپ چکے ہیں، علاوہ ازیں آپ کی ایک اہم اردو تصنیف "افکار رومی" ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ذکر تھا مولانا سید عبد الدائم الجلالی کا۔ مولانا جلالی مرحوم و مغفور عصر حاضر کے بلند پایہ عالم، بلکہ جامع العلوم تھے، تفسیر و حدیث، فقہ و ادب، منطق و فلسفہ اور تصوف پر گہری نظر رکھتے تھے، مطالعہ وسیع تھا، علوم متداولہ مستحضر تھے، وہ خطابت و تحریر دونوں میدانوں کے شہ سوار تھے۔

مولانا اعلیٰ درجہ کے کامیاب مدرس تھے۔ منطق ہو یا فلسفہ، ادب ہو یا تفسیر یعنی علوم عقلیہ و نقلیہ جدید و قدیم دونوں کی کتابوں کے پڑھانے کی صلاحیت و استعداد تامہ رکھتے تھے، کسی بھی مضمون کی

کتاب جو اُن کے سپرد کی جاتی تھی بہت عمدہ طریقے سے نہایت روانی کے ساتھ پڑھاتے تھے جس سے کہ طالب علم مکمل طور پر مطمئن ہو جاتا تھا۔ میں نے مرحوم سے عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں پڑھی ہیں، مقامات حریری جو عربی ادب کی نہایت مشکل کتاب ہے، اور جس میں مغلق و دقیق الفاظ و عبارات بکثرت ہیں، بغیر مطالعے اور بغیر غور و فکر و تامل کے پڑھایا کرتے تھے، اور ترجمہ اس قدر عمدہ کرتے تھے کہ اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں تھا، عموماً ایک عربی لفظ کے معنی ایک ہی اردو لفظ میں بیان کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عربی لفظ کا مقابل کوئی دوسرا اردو مترادف اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا، ایسا نہیں تھا کہ ایک لفظ کی تشریح دس دس الفاظ میں کریں تب کہیں طالب علم مفہوم سمجھے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ عربی الفاظ کے زیادہ معنی نہیں جانتے تھے، وہ حافظ لغت تھے، جس طرح عربی زبان اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے، ایک ایک عربی لفظ کے دس دس، بیس بیس، پچاس پچاس معانی ہیں، اسی طرح مولانا بھی ایک ایک عربی لفظ کے دسیوں معانی جانتے تھے۔

تفسیر قرآن پر عبور و بصیرت کے سلسلے میں مولانا کے صرف دو واقعے بیان کروں گا، اور وسعتِ معلوماتِ تصوف کے متعلق بھی دو ہی واقعے بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

تقریباً ۱۸ سال قبل مسجد درگاہ حضرت شاہ ابوالخیرؒ میں تراویح میں ختم قرآن کی مجلس تھی، حضرت مولانا زید ابوالحسن مدظلہٗ داعی تھے اور مولانا جلالی مدعو، کوئی بڑا اجتماع نہیں تھا، البتہ حاضرین پڑھے لکھے تھے۔ مولانا جلالی مرحوم نے قرآن کریم کے نزول و سببِ نزول پر نہایت جامع اور بصیرت افروز تقریر کی، کیا عرض کروں، اس تقریر کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ حضرت مولانا زید جو خود ایک متبحر عالم اور صاحب نسبت بزرگ ہیں، جھوم رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ کیا تبحر علمی ہے؟ افسوس کہ ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا کہ تقریر محفوظ کر لی جاتی۔

دوسرے واقعے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا جلالی مرحوم نے قیام دہلی کے دوران مسجد گلی قاسم جان دہلی میں دو مرتبہ قرآن عظیم ترجمہ و تفسیر میں ختم کیا۔

مولانا نہایت پابندی کے ساتھ روزانہ اپنے مکان واقع گلی مدرسہ حسین بخش والی نزد جامع مسجد سے گلی قاسم جان قبل از نمازِ فجر جایا کرتے تھے، حالانکہ یہ پابندی مولانا کی افتادِ طبع کے خلاف تھی، غالباً کبھی انھوں نے ایسی پابندی نہیں کی ہوگی۔

مسجدِ مذکور میں ترجمۂ و تفسیر کی ابتدا کا واقعہ بھی خاصا دلچسپ ہے، دہلی کے ایک لائق و مشہور عالم اس مسجد میں مدّتِ دراز سے ترجمۂ کلام اللہ کیا کرتے تھے، ختم کے روز مولانا جلالی کو اختتامی تقریر اور دعا کے لیے دعوت دی گئی، مولانا نے اپنی تقریر میں سورۂ اخلاص کے معانی و مطالب پر روشنی ڈالی اور الوہیت و توحید اور صمدیت کا مطلب بیان کیا، تخلیق و تولید کا فرق واضح کیا، غالباً تین روز میں تفسیر قل ہو اللہ مکمل ہوئی۔ سامعین اس سورت کی جسے وہ اپنی پنجوقتہ نمازوں میں پڑھا کرتے تھے، تفسیر و تشریح سے بہت متاثر و محظوظ ہوئے اور ممبران و صدرِ منتظمہ کمیٹی مسجد نواب خسرو مرزا صاحب نے کہا کہ اب آپ ہی اس مسجد میں ترجمہ و تفسیر کا درس دیا کریں، مولانا نے ہر چند منع کیا، لیکن دوسری طرف سے پیہم اصرار کی وجہ سے مولانا نے تفسیر کا درس شروع کیا۔

تصوف پر گہری نظر اور وسعتِ معلومات کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہوتا ہے:

چند سال قبل میں اور میرے ایک فاضل دوست جو علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی ہیں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف رمز آشنائے تصوف بھی ہیں۔ گفتگو کا رُخ تصوف اور وحدت الوجود کا باضابطہ نظریہ پیش کرنے والے حضرت محی الدین ابن عربیؒ اور ان کی ادق کتابوں کی طرف مڑ گیا۔ مولانا نے اس وقت طویل تقریر نہیں کی بلکہ چند سوالات کیے اور مختصر طور پر چند رموزِ تصوّف بیان کیے، جس پر ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ آج معلوم ہوا کہ ہم بے پڑھے لکھے ہیں۔ ہم نے اس موضوع پر کچھ نہیں پڑھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ذکر تھا مجالس عرس و بزم مقالات حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا، مولانا فرمانے لگے کہ یہ لکھنا اور بیان کرنا بہت آسان ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی کب اور کہاں ولادت ہوئی، لباس کیسا پہنتے تھے، کھانا کیسا تناول فرماتے تھے وغیرہ وغیرہ لیکن حضرت کی زندگی کا اصل مقصد، جس کی تبلیغ میں حضرت نے اپنی عمر عزیز صرف کر دی، یعنی حقیقت تصوف، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اور اصل چیز یہی ہے، بعض اوقات تصوف خصوصاً نظریۂ وحدت الوجود پر نجی صحبتوں میں نہایت بصیرت افروز تقریر فرماتے، رموز و اشاراتِ تصوّف جا بجا ان کی تفسیر بیان السبحان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے منتسبین میں بہت کم حضرات کو یہ معلوم ہو گا کہ مولانا جلالی نظریۂ وحدت الوجود کے قائل و حامی تھے۔

مولانا جلالی مرحوم ذہانت کے اعتبار سے عبقری (جینیس) تھے۔ ان کی ذہانت کے بہت سے واقعات ہیں جو ان کے شاگردوں اور احباب کو یاد ہوں گے، میں چند مختصر واقعات اِس سلسلے میں بیان کروں گا

مولانا جلالی مرحوم کے فارسی زبان و ادب کے آخری امتحان منشی فاضل جو اس زمانے میں نہایت مشکل اور اہم امتحان ہوتا تھا، کے پاس کرنے کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ مولانا نے ارادہ کیا منشی فاضل کے امتحان دینے کا جبکہ صرف ۲۵ روز بعد امتحان ہونے والا تھا، علی نقی صاحب شادماں مرحوم جو فارسی امتحانات کے مدرسہ عالیہ میں انچارج تھے، ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ نصاب کی کتابیں آپ کے پاس ہیں نہیں، دن بہت تھوڑے باقی ہیں، آپ کیسے امتحان دیں گے؟ مولانا نے اپنے برادر حقیقی مولوی سیّد عبد السّلام صاحب سے کہا کہ امتحان ضرور دوں گا۔ رام پور کے ایک اور صاحب جن کے والد سے مولانا کے والدِ بزرگوار کے تعلقات تھے منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہو رہے تھے، ان کے والد ہی کے ذریعے طے ہوا کہ ان کی کتابیں مستعار لی جائیں، چنانچہ ایک کتاب صبح ساڑھے نو بجے لی جاتی تھی اور پانچ بجے شام واپس کر دی جاتی تھی، یعنی ایک کتاب کا مطالعہ صرف ایک روز کیا، بس یہی تیاری تھی، امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔

وزیر احمد صاحب ہیڈ ماسٹر مرتضیٰ اسکول رامپور نے فارسی میں ایم اے کا امتحان مولانا سے پڑھ کر دیا تھا۔ موصوف فرماتے تھے کہ میں نے ایسا انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا، فارسی کی جو کتاب ان کے سامنے رکھ دیتا ہوں، بغیر مطالعے کے اپنی ذہانت سے اس کا مطلب سمجھا دیتے ہیں، گھر آکر جب قاآنی اور خاقانی کی شرح دیکھتا ہوں، تو سب کچھ وہی ہوتا ہے جو مولانا سمجھا دیتے ہیں۔

غالباً ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ رامپور تشریف لائے، مدرسہ عالیہ رامپور میں آپ کے خطاب سے قبل چند توصیفی کلمات حضرت شیخ الاسلام کی شان میں مولانا جلالی نے کہے، مولانا مدنی نے اپنی تقریر میں اظہار ناراضگی فرمایا کہ لوگ میرے متعلق تعریفی کلمات کہنے میں مبالغہ کرتے ہیں جو نامناسب ہے تقریر ختم ہونے کے بعد مولانا جلالی شکریہ ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور برجستہ ان کلمات توصیفیہ کی بہت عمدہ فلسفیانہ انداز میں تشریح کی، اور ایک ایک تعریفی جملے کا جو انھوں نے مولانا مدنی کے متعلق کہے تھے وضاحت کی اور کہا کہ

میں نے مبالغہ نہیں کیا۔ کیا حضرت مدنی ان صفات سے متصف نہیں ہیں حضرت مدنی مسکرانے لگے۔

شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ مولانا عبدالدائم صاحب خطابت و تحریر دونوں میدانوں کے شہ سوار تھے، لیکن ان کی خطابت سے عوام کم اور خواص زیادہ مستفید ہوتے تھے، مولانا پیشہ ور واعظ نہیں تھے اس لیے ان کی تقریروں میں اتار چڑھاؤ نہیں تھا، اور نہ ان کی تقریریں لطائف و قصص ہوتے تھے، لیکن موصوف کی تقریر بے جھجک، سادہ اور ایسی مربوط ہوتی تھی کہ اگر لکھ لی جائے تو ایک بسوط مقالہ تیار ہو جائے، بلکہ تقریر مقالہ ہی ہوتی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ غالب اکیڈمی میں ایک ماہر تعلیم پروفیسر کا اردو میں ایک مقالہ سنا، کچھ لوگوں کا اور خود میرا یہ خیال تھا کہ پروفیسر موصوف تقریر کر رہے ہیں لیکن معاً یہ خیال و تعجب ہوا کہ ایسی مربوط تقریر مولانا جلالی کے علاوہ کون کر رہا ہے، فوراً بعد ہی تعجب رفع ہو گیا کہ پروفیسر موصوف مقالہ پڑھ رہے تھے تقریر نہیں کر رہے تھے۔ مولانا جلالی کی گفتگو بھی مربوط اور منطقی اسلوب پر ہوتی تھی۔

مولانا کا دوسرا اہم میدان تصنیف و تالیف ہے، جس کے باعث وہ وفات کے بعد بھی زندہ رہیں گے، اور طالبانِ علم و جویانِ حق ان کی تالیفات سے مستفید ہوتے رہیں گے، اور یہ عبادت مولانا مرحوم کی آخرت کے لیے باعث اجر ہوگی۔ انشاء اللہ۔

اپنے ابتدائی دور میں تقریباً پچاس ساٹھ سال قبل مولانا جلالی مرحوم نے ایک ماہنامہ "معلم عربی" کے نام سے شائع کیا، جس میں ایک جانب عربی ہوتی تھی اور دوسری طرف اردو۔

دوسرا مشہور مجلہ جس کا اجرا پہلے "اتحاد اسلامی" اور پھر "اتحاد" کے نام سے کیا گیا، اس رسالے کی مجلس ادارت میں مشہور شاعر راز یزدانی اور محشر عنایتی شامل تھے، رئیس التحریر مولانا سید عبدالدائم صاحب تھے، اس رسالے کے مضامین سے مولانا کی وسعتِ معلومات اور لائق صحافی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

غالباً اسی زمانے میں مولانا مرحوم نے ایک کتاب "شعر العرب" علامہ شبلی نعمانیؒ کی کتاب "شعر العجم" کے طرز پر تالیف کرنا شروع کی تھی، جاہلی شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ پہلی جلد کی شکل میں بطور مسودہ مولانا کے برادرِ خورد مولوی سید عبدالسلام صاحب کے پاس موجود ہے، اگر یہ کتاب طبع ہو جاتی تو طلباء و اساتذہ ادب عربی کے لیے معقول ادبی و علمی سرمایہ مہیا ہو جاتا۔

اسی دور میں مولانا نے استاذ عبدالحسین عراقی کی تالیف "الزهور فی رامبور" کے لیے عربی میں کافی مواد فراہم کیا، یہ کتاب رامپور اور نوابانِ رامپور کی بزبان عربی تاریخ ہے۔

مولانا سید عبدالدائم صاحب کثیرالترجمہ اور سریع الترجمہ تھے۔ تقریباً پچاس سال قبل صحاح ستہ میں سے پانچ کتابوں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ تجرید بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ یہ سب تراجم زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ کتبِ مذکورہ کا سادہ اور شستہ زبان میں ترجمہ کیا ہے، جو اس قدر عمدہ اور جامع ہے کہ ترجمہ پڑھنے کے بعد شرح کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حدیث شریف کا معیار اور پوری احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ان تراجم سے عوام و خواص دونوں مستفید ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ سُنا گیا ہے کہ ان میں سے بعض تراجم حال میں بعض چور مصنفین نے اپنے نام سے شائع کیے ہیں۔

امام الاولیاء حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی کتاب "غنیۃ الطالبین" کا ترجمہ بھی انھیں کا کیا ہوا ہے، جو پاکستان میں عرصہ ہوا چھپ چکا ہے۔

ایک چھوٹا سا رسالہ "مبادیٔ منطق و فلسفہ" طلباء کے لیے تحریر کیا ہے، جو دس روز کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ رسالہ داخلِ نصاب جامعہ طبیّہ و طبیّہ کالج ہے۔ اس رسالہ کا دیباچہ ملاحظہ ہو:-

"جامعہ طبیّہ گلی قاسم جان دہلی کے مدیر بے مثال جناب حکیم گردت سنگھ الگ صاحب نے مجھے حکم دیا کہ منطق و فلسفہ مشائیہ کے کچھ مباحث و مبادی کو سادہ اُردو میں لکھ دوں جو ذہنوں کو الجھا دینے والے اجمال اور طبیعتوں کو اکتا دینے والی تفصیل سے پاک ہو۔ طلباء طب کے لیے غیر ضروری مباحث بھی نہ ہوں اور ضروری فنی نظریات بھی قلم انداز نہ کیے گئے ہوں۔ عربی اصطلاحات کی بندش سے ایک حد تک آزاد بھی ہو اور اسی کے ساتھ کتبِ طب خصوصاً کلیات میں جو فنی اصطلاحی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان کو سمجھنا سمجھانا دشوار بھی نہ رہ جائے — مسائل و مبادی کو خطاب کے طور پر بیان کیا جائے اور طلبۂ طب کی رعایت سے معقولات کے مباحث کو طب سے تعلق رکھنے والی مثالیں دے کر محسوس بنا دیا جائے۔

مسافت لمبی تھی۔ رہگذر میں کانٹے بچھے ہوئے تھے۔ مسافر آبلہ پا تھا۔ منزلِ مقصود

کا چہرہ دھندلکے میں گم تھا' لیکن ناطاقتی اور زادِ راہ نہ ہونے کے باوجود حکم کی تعمیل ضروری تھی۔

آبدار موتی پا لینے کا دعویٰ تو وہی تیراک غوطہ خور کر سکتے ہیں جو دریا کی لہروں پر قابو رکھتے ہیں' میں نے ساحل بھی نہیں دیکھا شناور ہونے کا خیال تو کجا۔ بہر حال کچھ دبے کچھ ابھرے ہوئے کج مج نقوش ہیں جو پیش کر رہا ہوں۔

کاش کوئی مصور آئے اور میری بنائی ہوئی اس تصویر کو اجاگر کر دے۔

عبد الدائم الجلالی

خادم جامعہ طبیہ گلی قاسم جان دہلی

تفاسیر کے ذکر سے قبل ایک عربی کتاب "الغزو الفکری" کے ترجمے کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ کتاب موجودہ دور کے ایک اخوانی عالم کی ہے' جس میں جدید اصطلاحات بھی استعمال کی گئی ہیں۔ یہ ترجمہ جماعتِ اسلامی کے کسی معتمد کے پاس محفوظ ہے' طبع نہیں ہوا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی بے محل نہیں ہو گا کہ مولانا کو عربی بولنے پر گو زیادہ قدرت نہیں تھی' لیکن سمجھنے' پڑھانے اور ترجمہ کرنے پر چاہے جدید عربی ہو یا قدیم قدرتِ تامّہ رکھتے تھے' لغت و ادبِ عربی کے ماہر تھے۔

اُن کی ایک اور اہم کتاب "لغات القرآن" ہے' غین سے یا تک' ( الف سے عین تک مولانا عبد الرشید نعمانی کی تالیف ہے ) یہ ایک علمی کتاب ہے جس میں قرآنِ عظیم میں مستعمل کلمات کے معانی و مطالب نہایت تحقیق و محنت سے بیان کیے گئے ہیں' جیسا کہ کتاب کے نام سے بھی ظاہر ہے' طابع و ناشر ندوۃ المصنفین دہلی ہے' اس تالیف سے اہلِ علم' طلّاب و مدرسینِ مدارسِ عربیہ استفادہ کرتے ہیں۔ مجھ سے اسلامیات و عربی کے ایک فاضل استاذ فرماتے تھے کہ ترجمۂ احادیث تو عوام کے لیے ہے لیکن "لغات القرآن" سے ہم لوگ یعنی اساتذہ و مدرسین اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ تفسیر مظہری کا ترجمہ بھی مولانا مرحوم کا مشہور و معروف کارنامہ ہے۔ قرآنِ کریم کی ہندوستان میں لکھی جانے والی تفاسیر میں' عربی زبان میں یہ عظیم ترین تفسیر ہے۔ یہ قول بروایت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ' محدثِ اعظم علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کا ہے۔

اس تفسیر کے مؤلف ہیں علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی شاگرد رشید امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ۔ اس کا تشریحی ترجمہ ضروری اضافات کے ساتھ بزبانِ اردو مولانا سید عبدالدائم صاحب جلالی نے کیا ہے، جو گیارہ ضخیم جلدوں میں ہے۔ مولانا نے یہ ترجمہ ساٹھ سال کی عمر کے بعد شروع کیا تھا، گویا یہ آپ کے آخری دور کی یادگار ہے۔ ترجمہ بہت عمدہ اور صاف و سادہ ہے کہ ہر ایک پڑھنے والا سمجھ لے اور مطمئن ہو جائے، آسان زبان میں ہے، جو مولانا کی زبان اور تحریر نہیں معلوم ہوتی اور ضروری اضافات بشکل نوٹس کا انداز تحریر نہایت مشکل اور فلسفیانہ ہے، جو مولانا کا طرز نگارش ہے، تعجب ہے کہ ایک ہی کتاب میں تحریر کے دو اسلوب ہیں، جو مولانا کے ماہر ترجمہ ہونے پر دال ہیں۔ غالباً ترجمے میں مولانا نے مؤلف کے اسلوب و طرز کی اتباع و پابندی کی ہے، اور اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ہر شخص کتاب کا مفہوم سمجھ لے، اور ضروری اضافات میں اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔

چونکہ مولانا جلالی خود ایک لائق مفسر تھے اس لیے اضافات میں کہیں کہیں مؤلف سے نہایت ادب کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے۔ یہ ترجمہ کتابت و طباعت اور کاغذ کے اعتبار سے بہت عمدہ اور لائق تحسین ہے، جو حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مرحومؒ[1] کے علم و فضل، حسن ذوق اور آپ کے ادارے ندوۃ المصنفین کے سلیقۂ اشاعتِ کتب کا مظہر ہے، مفتی صاحب اس لیے بھی قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمے کے لیے سید عبدالدائم صاحب جیسے لائق مفسر اور ماہر مترجم کا انتخاب کیا۔

آخر میں مولانا جلالی کی اہم اور مایۂ ناز تالیف کا جس پر موصوف کو بھی ناز تھا۔ تفسیر قرآنِ عظیم جو "بیان السبحان" کے نام سے موسوم ہے، کا ذکر کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔

یہ تفسیر وسیم بکڈپو، فائن آرٹ پریس دیوبند سے ۳۰ پاروں میں شائع ہوئی ہے۔ کتابت و طباعت کے اعتبار سے ناقص ہے بلکہ طباعت کتابت سے زیادہ قابلِ مذمت، اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہر پارے کے آخری صفحہ پر اشتہارات ہیں، کچھ پاروں کے آخری صفحات پر فیشن ایبل گھڑیوں، برقعوں اور زیورات کے اشتہارات بھی ہیں، اس پر مولانا مرحوم بھی اظہار افسوس کیا کرتے تھے۔

"بیان السبحان" موجودہ دور کی بہترین تفسیر ہے جو قدماء کے طرز پر لکھی گئی ہے اور جس میں دلائل نقلیہ و عقلیہ دونوں بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا نے ترتیب اس طرح رکھی ہے، پہلے ترجمہ آیات

---

[1] مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ۱۲ر مئی ۱۹۸۴ء کو رحلت فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

قرآنی کا بین السطور ہیں، اس کے بعد تفسیر تفصیلی طور پر جس میں مفسرین کے اقوال بیان کرنے کے بعد قوی قول کو ترجیح دی گئی ہے، بعد ازاں مقصود بیان، یعنی خلاصہ آیات ہے جو نہایت جامع ہوتا ہے اور آخر میں اکثر مقامات پر رموز و اشارات تصوف۔ کہیں کہیں نکات اور ضروری ہدایات کا عنوان بھی قائم کیا گیا ہے اور کہیں کہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کرتے ہیں، لیکن قرآن وسنت واقوالِ صحابہ کی روشنی میں بقدرِ امکان غور کر کے کلامِ الٰہی کے سربستہ راز سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ ہم کو انہی کی (یعنی صحابہؓ کی) پیروی کرتے ہوئے قرآن مجید کے معارف جاننا اور کلامِ پاک کی تفسیر سمجھنا فرضِ قطعی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر "تفہیم القرآن" موجودہ دور کی بہترین تفسیر ہے، اس کی عبارت میں روانی اور شگفتگی ہے، زبان کے اعتبار سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے، اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا "ترجمان القرآن" بھی ایک عظیم تفسیر ہے بلکہ علماء کی رائے ہے کہ نقشِ اول مولانا آزاد کا ترجمان القرآن ہے اور نقشِ ثانی مولانا مودودی کی تفہیم القرآن اضافات کے ساتھ، لیکن باعتبار کثرتِ اقوال مفسرین وطریقۂ متقدمین اور رموزِ تصوف، مولانا جلالی کی تفسیر منفرد ہے۔ یہ تفسیر عوام ہی کے لیے نہیں بلکہ اس سے خواص بھی جن میں طلباء، اساتذہ اور صوفیاء بھی شامل ہیں، استفادہ کرتے ہیں۔ ایک اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہو:-

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط

**ترجمہ:** اے ہمارے پروردگار ان میں سے ہی ایک پیغمبر پیدا کرنا جو ان کے سامنے تیری آیات پڑھے، اور ان کو کتاب وشریعت سکھائے اور ان کو پاک صاف کر دے۔

اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں:

"تفسیر: گزشتہ آیات میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ضمنی طور پر دعائے ابراہیمی میں دخل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے صرف امتِ مسلمہ کے لیے دعا کی تھی۔ اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ صراحتاً اپنی دعا میں حضورِ گرامی کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس امر کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ کعبہ کی حفاظت اور نگہداشت امتِ مسلمہ کرے گی، لیکن امتِ مسلمہ کو ضرورت ایک

سرداری ہوگی، جو ہر طرح سے اس امت مرحومہ کی قیادت کرے گا، اور تمام سعادات و برکات اسی کے چشمۂ فیض سے وابستہ ہوں گی۔ مطلب یہ ہے کہ الٰہی امت مسلمہ کے لیے ایک رسول ان ہی میں سے مبعوث فرمانا، اور یہ رسول نہایت عظیم الشان عالی مرتبہ ہو، اس کے اندر وہ اوصاف و اخلاق اور نور معارف موجود ہوں جس سے عام و خاص، جاہل و عالم، تاریک دماغ رکھنے والے اور نور فطری کے حامل سب یکساں فیضیاب ہوں اور ہر شخص اس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو۔

**يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ** ، یعنی عام لوگوں کو تیری آیات اور مقدس کلام پڑھ کر سُنائے ، ان کو شریعتِ الٰہیہ کے ظاہری احکام بتائے۔

**وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ** ، یعنی جو لوگ عالم ہیں لیکن علمار میں ان کا مرتبہ امتیازی نہیں بلکہ عمومی ہے، تو ایسے علمار کو وہ کتاب مقدس کی تعلیم دے، احکام اور ادلّہ بتائے، فروع و اصول سے واقف کرے اور دلائل توحید و نبوت سمجھائے۔

**وَالْحِكْمَةَ** ، یعنی جو لوگ علمار میں امتیازی شرف رکھتے ہیں، قوتِ اجتہاد کے مالک ہیں علمی تبحّر اور وسعتِ معارف کی وجہ سے صرف احکام و ادلہ کا علم ان کے لیے سیر کُن نہیں ہے، بلکہ ان کو اسرار حق کی ضرورت ہے تو ایسے لوگوں کو اسرارِ شریعت کی تعلیم دے، حقائق و معارفِ الٰہیہ بتائے، رموزِ کتاب سے واقف کرے۔

**وَيُزَكِّيْهِمْ** ، یہ مرتبہ خاصانِ خاص کا ہے، اولیائے امت ہی اس مرتبہ سے سرفراز ہیں۔ ان کے نفوسِ قدسیہ ہو بہو کمالِ نبوت کا آئینہ ہیں، جن کے اندر نورِ نبوّت چمکتا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ نبی روشن روح رکھنے والوں کے تزکیہ کا بھی سبب ہے، اُن کے آئینۂ دل میں اپنی روحانی تعلیم کے پانی سے تمام سیاہی اور زنگ دور کرکے اپنے فیوضِ قدس اور نور رسالت سے اُن کو منور کردے۔

**مقصودِ بیان:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور تمام امّتِ مسلمہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا نتیجہ ہے۔

امّتِ اسلامیہ میں چار طبقات ہیں، عام، خاص، خاص الخاص، اخص الخاص، خاص کی ہدایت کے لیے صرف معجزات اور ظاہری آیاتِ قرآنیہ اور قرائن نبویہ مخصوص ہیں۔
خاص کی ہدایت کے لیے احکام، ادلہ، فروع واصول، دلائل توحید وبراہین رسالت کا علم ضروری ہے، خاص الخاص کے افادے کے لیے اسرارِ شریعت، حقائق ومعارف اور رموز کی تعلیم ضروری ہے۔
اخص الخاص میں تخلیۂ رذائل اور تجلیہ بالفضائل کا مادہ تو موجود ہی ہوتا ہے، ان کی روحیں سعید اور دل مادۂ ہدایت سے لبریز ہوتے ہیں، لیکن تخلیہ کے بعد ان کے قلوب کی صفائی اور تجلیہ وتزکیہ کی بھی احتیاج ہے اور یہ سب کام جس حُسن وخوبی سے حضور اقدسؐ نے انجام دیے وہ عدیم النظیر ہیں۔ حضورِ والا اشرف المخلوقات، اشرف الانبیاء اور خاتم النبیین ہوئے۔ سچ ہے:۔
کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ، آیت میں ایک لطیف تلمیح اس طرف بھی ہے کہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ہر مرتبے کو طے کرکے اوپر والے درجے میں پہنچنے کی کوشش کرے تاکہ انتہا پر پہنچ کر کمالاتِ محمدیہ کا مکمل آئینہ اور مجسمۂ اخلاق بن جائے، اسی لیے حضورؐ نے فرمایا کہ علماء امتی کأنبیاء بنی اسرائیل۔
آخر میں مولانا واستاذنا حضرت سید عبدالدائم صاحب کی زندگی کے متعلق چند ضروری معروضات بعض حضرات کے سوالات کے جوابات بھی عرض کردوں۔
مولانا مرحوم کبھی بھی طالب شہرت نہیں ہوئے، اسی لیے وہ عوام میں ایسی شہرت وقبولیت حاصل نہ کرسکے، جس کے وہ مستحق تھے۔ خواص میں وہ ضرور ایک مشہور ومستند عالم تھے، لیکن یہ شہرت بھی بہت زیادہ نہیں تھی، اپنے بے پناہ علم وفضل کے اعتبار سے دوسرے عظیم ومشہور علماء کی طرح وہ بلند مقام حاصل نہ کرسکے، جس کا انھیں استحقاق تھا، اس میں علاوہ خواہش وطلب شہرت نہ ہونے کے دوسرے موانع بھی ہیں۔
۱۔ گوشہ نشینی، عوام سے ربط زیادہ نہ ہونا۔
۲۔ اظہارِ صداقت وبیباکی جس سے عوام تو عوام خواص بھی گھبراتے تھے۔
۳۔ جلالِ سادات۔

ایک بات اور بھی عرض کر دوں، پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند، مولانا کی پشت پر کوئی ایسا ادارہ یا جماعت نہیں تھی، جو انھیں ان کا صحیح مقام دلاتی اور ان کے علم و فضل کا پروپیگنڈہ کرتی۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جس کا میں نے بارہا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ نہایت قابل لوگ بھی اور ایسے حضرات بھی جو ہر وقت مباحثے کے لیے تیار رہتے تھے، مولانا سے علمی گفتگو کرتے ہوئے گھبراتے تھے، اور ان کے منطقی دلائل سے لاجواب ہو جاتے تھے، نیز بریلوی و دیوبندی دونوں مکاتب فکر کے علماء ان کا اکرام اور اعتراف علم و فضل کرتے تھے یا اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔

ایک شیعہ عالم و مجتہد کا واقعہ مجھے یاد ہے، موصوف کا نام تھا مولانا محسن نواب، جو عربی کے ایک لائق ادیب تھے اور عراق میں بارہ سال رہ کر تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے جدید عربی بولنے اور لکھنے پر قدرتِ تامہ رکھتے تھے، میں نے ان سے عربی شعر کی کتاب حماسہ پڑھی ہے، اکثر اشعار کا ترجمہ عربی میں ہی کیا کرتے تھے۔ مولانا محسن نواب صاحب مدرسہ عالیہ رامپور میں پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے اور مولانا جلالی استاذ درجہ فاضل۔ شیخ القراء قاری عبد الواحد صاحب نے اپنی سندِ قرارت جدید عربی اسلوب کے مطابق ترمیم کے لیے میرے ذریعے مولانا محسن نواب صاحب کے پاس بھیجی لیکن موصوف نے یہ سن کر کہ مولانا جلالی بنظر اصلاح یہ سند ملاحظہ فرما چکے ہیں، ترمیم و اصلاح سے یہ کہہ کر سختی سے انکار کر دیا کہ ایک بزرگ عالم کی اصلاح و معائنہ کے بعد میں ہرگز اصلاح نہیں کروں گا، ایک لفظ کے بھی اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر مولانا جلالی مرحوم کی زندگی کے مندرجہ ذیل گوشوں پر روشنی نہ ڈالوں۔

مولانا مرحوم کے نزدیک مسلمانوں کی اقتصادیات شریعت اسلامیہ کی روشنی میں سدھارنے کا کام بہت اہم تھا، وہ ہمیشہ اپنی گفتگو میں اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ تعلیمات اسلامی کے مطابق مسلمان کا مالی نظام ہونا چاہیے، وہ فرماتے تھے کہ عبادات، نماز روزے کے ساتھ ساتھ معاملات کی درستی پر بھی زور دینا چاہیے کہ یہ بھی عبادت ہے۔ اور دلیل عقلی سے ثابت کرتے تھے کہ اسلام کا معاشی نظام دنیا کے ہر اقتصادی و معاشی نظام کو چیلنج کرتا ہے کہ اس سے بہتر معاشی نظام کسی بھی ازم کے پاس نہیں ہے اور اس سے مکمل طور پر مسلمان اپنی پسماندگی دور کر سکتا ہے۔ ایک مرتبہ مولانا نے

حضرت مولانا یوسف صاحبؒ امیر جماعتِ تبلیغ سے کہا تھا کہ مولانا آپ اپنی تبلیغی سرگرمیاں صرف پابندی نماز و روزہ اور چلّہ و گشت تک محدود نہ رکھیں، بلکہ اپنے نصاب تبلیغ میں مسلمانوں کے مالی نظام کی اصلاح کو بھی شامل کرلیں، جو لوگ گشت یا چلہ کے لیے کسی آبادی میں جائیں ان کے ذمہ یہ بھی قرار دیں کہ وہ تلاش کریں کہ اس گاؤں یا محلے میں کوئی ننگا بھوکا تو نہیں ہے، اگر ہے تو اس کی ضرورت وہاں رہنے والے دوسرے مالدار و صاحبِ حیثیت افراد سے پوری کرائیں، مولانا یوسف صاحب مرحوم و مغفور نے اس رائے سے اتفاق کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس کی افادیت و ضرورت سے انکار نہیں ہے اور میں اس سلسلے میں غور کروں گا۔

دوسری اہم بات، مولانا جلالیؒ موجودہ دور کے جدید مسائل کو تعلیماتِ اسلامی کی روشنی میں بہت عمدہ طریقے سے حل فرماتے تھے، اسی لیے وہ سائنس کی تعلیم کو بہت اہم قرار دیتے تھے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نئی نسل کے نیا ذہن رکھنے والے، جدیدیت پسند یا عقلیت پرست حضرات بھی مولانا کے پاس آتے تھے، اور مولانا کی گفتگو سے متاثر ہوتے تھے، مولانا کبھی ایسے حضرات کی دل آزاری نہیں کرتے تھے، ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے تھے اور اپنی مدلل منطقی گفتگو سے انھیں قائل کرتے اور ان کے شکوک کو رفع فرما دیتے تھے نیز انھیں مسائل حاضرہ کو شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

عمر کے آخری حصے میں مولانا مرحوم مدرسہ عالیہ فتحپوری (دہلی) میں استاذ اور مفتی رہے، میں اپنا مقالہ مولانا کے عزیز ساتھی قاری محمد میاں استاذ مدرسہ عالیہ فتحپوری کے اس قول پر جو موصوف نے مولانا مرحوم کی وفات کے دوسرے روز کہا تھا ختم کرتا ہوں، قاری صاحب نے فرمایا کہ کل علم کی ایک تاریخ لپٹ گئی۔ تغمدہ اللہ فی فسیح جناتہ

# مولوی سیّد عبدالدّائم جلالیؔ

جناب مولوی سید بہار الحق رضوی (ایڈوکیٹ)
صدر صولت پبلک لائبریری۔ رامپور

مولوی سید عبدالدائم جلالی ابن مولوی سید عبدالقیوم (متوفی ۵ فروری ۱۹۳۰ء) ابن سید کاظم علی ابن سیّد انور شاہ ابن مولانا سید سلطان احمد شاہ (متوفی دسمبر ۱۸۰۷ء) رام پور محلہ راجدوارہ میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب بخارا کے مشہور بزرگ حضرت جلال بخاری سے ملتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو جلالی لکھتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں مولانا سید سلطان احمد شاہ صاحب عرف شاہ بھولے میاں صاحب محمد شاہ بادشاہ غازی کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہوئے پھر تحصیل آنولہ ضلع بریلی میں منتقل ہوئے۔ ان کو دو گاؤں کلیہ و کربلا معافی میں دیے گئے۔ سید سلطان احمد صاحب رامپور آئے اور محلہ راجدوارہ میں مقیم ہوئے۔ رام پور میں ان کا انتقال ہوا دریائے کوسی کے قریب قبرستان میں دفن ہوئے لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کے بیٹوں نے اور چند محلہ والوں نے خواب میں دیکھا کہ موصوف یہ فرما رہے ہیں کہ تم سو رہے ہو اور میری قبر دریا کاٹ رہا ہے۔ باہم مشورے سے نواب رامپور کی مرضی کے خلاف قبر کھودی گئی جنازہ صحیح حالت میں پایا گیا جس کو موضع کلبہ لے جایا گیا اور وہاں دفن کیا گیا۔ مولانا سید سلطان احمد کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک سیّد اکبر شاہ ان کی اولاد آج بھی کلبیہ میں آباد ہے۔ دوسرے بیٹے انور شاہ ہوئے جن کے دو صاحبزادے مولوی حسن شاہ اور مولوی سیّد کاظم علی ہوئے۔ مولوی سیّد کاظم علی کا ذکر تذکرہ کاملان رامپور میں صفحہ ۳۳۱ پر نہایت تفصیل کے ساتھ

ہے۔ مولوی حسن شاہ اور کاظم علی دونوں بھائی علومِ ظاہری و باطنی میں اہمیت رکھتے تھے۔ مولوی سید کاظم علی کی اولاد میں تین لڑکے حکیم محمد یحییٰ[1] عبدالحیٔ، مولوی سید عبدالقیوم اور ایک صاحبزادی (حافظہ قرآن کریم) حافظی در نجف[2] ہوئیں۔ مولوی عبدالقیوم مولوی سید عبدالدائم جلالی کے والد تھے۔

مولوی عبدالقیوم نے شروع سے ہی اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر کافی توجہ کی اور ان کے تینوں لڑکے مولوی عبدالقائم، مولوی عبدالدائم اور مولوی عبدالسلام نے مروجہ علوم کی تکمیل کی۔ لیکن اوّل الذکر نے عدالتی ملازمت اختیار کی اور آخرالذکر نے انگریزی اسکولوں میں مدرس کے فرائض انجام دیے۔

مولانا سید عبدالدائم کی ابتدائی تعلیم حسبِ رواج گھر پر شروع ہوئی اور انھوں نے اردو کی ابتدائی کتابیں محسن خاں سے پڑھیں اور قرآن شریف اپنی والدہ سے پڑھا۔ اسی زمانہ میں مولوی علی حسین کے مکتب میں داخل ہوئے اور ان سے اردو اور حساب پڑھا۔ اس کے بعد اپنے چچا مولوی سید عبدالحیٔ سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ مولانا اپنے چچا اور استاد مولانا عبدالحیٔ سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا نے مجھے بتایا تھا کہ عبدالحیٔ صاحب فارسی میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ مولانا نے فارسی کی تمام متداولہ کتابیں مولانا عبدالحیٔ سے پڑھیں۔ گفتگونامہ، حمد باری، توقیعات کسریٰ، انشائے خلیفہ، انشائے مادھورام، سہ نثر ظہوری، بہار دانش، انوار سہیلی، رسالہ حسن و عشق، مینا بازار، اخلاق محسنی، سکندرنامہ، مثنوی مولانا غنیمت کشمیری، گلستاں و بوستاں اور چند دوسری کتابیں مولوی صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھیں اور اس کے ساتھ ساتھ عربی صرف و نحو بھی ان سے ہی پڑھی۔

اس کے بعد مولانا کے والد نے ان کی اور اپنے دوسرے بیٹوں کی عربی تعلیم کے لیے مولوی شجاع الحق شواتی کو اپنے گھر پر رکھ لیا اور مولانا سواتی نے ان کو اور ان کے بھائیوں کو گھر پر عربی کی تعلیم دی۔ مولانا شواتی کی تعلیم سے ان کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان سے تعلیم کے دوران ہی مولانا نے شہر کی مشہور

---

[1] حکیم محمد یحییٰ کا ۱۳۱۶ھ میں انتقال ہوا شاہ بغدادی صاحبؒ کے مزار میں دفن ہوئے۔ اغفرلہ مادۂ تاریخ وفات ہے۔ وہ اپنے وقت کے معروف طبیب تھے۔ اور حکیم علی حسین خاں لکھنوی اور حکیم ابراہیم خاں کے شاگرد تھے۔ "تذکرۂ کاملان رام پور" از احمد علی شوق صفحہ ۳۸۱۔

[2] درِ نجف حکیم سید محمد الیاس کی والدہ تھیں۔ اور جید حافظہ تھیں۔

اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والی علمی درسگاہ مدرسۂ عالیہ رامپور میں داخلہ حاصل کر لیا۔

مولانا کو اپنے زمانۂ طالب علمی سے ہی علمی ذوق تھا۔ محنت نے اور چار چاند لگا دیے۔ آپ نے ایک ایک سال میں دو دو درجے پاس کیے جیسا کہ اس ادارے میں اچھے طالب علموں کو دو درجے پاس کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ بالآخر ۱۹۱۸ء میں مولانا فارغ التحصیل ہو گئے۔ اس زمانے کے بیشتر اہم اور مشہور اساتذہ سے آپ کو شرف تلمذ حاصل ہوا۔ آپ اپنے استادوں میں مولوی معز اللہ خاں، مولانا امین افغانی اور مولانا فضل حق رام پوری پرنسپل مدرسہ عالیہ سے بے حد متاثر تھے۔ مولانا فضل حق اپنے زمانہ کے مشہور عالم و فاضل تھے اور سارے ملک میں شہرت رکھتے تھے۔ فلسفہ اور منطق میں مولانا نے ان سے کلام فلسفہ اور منطق کی کتابیں "شرح مطالع" "شمس بازغہ" اور دوسری رائج کتابیں پڑھیں۔ اسی زمانہ میں آپ نے مولانا نذیر الدین (شاگرد علامہ عبدالحق صاحب خیرآبادی) اور مولانا وزیر محمد خاں صاحب سے بھی چند سبق پڑھے اور سند حدیث مولوی سید حامد شاہ محدث[۱] قاضی شہر (فرزند و جانشین حضرت مولانا محمد شاہ محدث[۲]) سے حاصل کی۔ آپ کے خاندان میں آپ کے چچا حکیم سید محمد یحییٰ اور آپ کے پھوپھی زاد بھائی حکیم سید محمد الیاس[۳] (پسر حافظی، ملانی سیدہ درنجف) بحیثیت عالم اور طبیب کافی شہرت رکھتے تھے اس لیے آپ کے والد کو یہ شوق تھا کہ مولانا بھی طب پڑھیں۔ اس لیے آپ کو دہلی بھیجا گیا اور طبیہ کالج میں آپ نے داخلہ لے لیا۔ چار سال طبیہ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ چونکہ مطب کرنے کا آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے والد کے انتقال پر تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں

---

[۱] قاضی حامد شاہ ولد میاں محمد شاہ محدث رامپوری نے ۱۹۰۷ء میں اپنے والد کے حکم سے "مدرسۂ عزیزیہ" قائم کیا جو آج بھی موجود ہے۔

[۲] میاں محمد شاہ محدث اپنے والد مولوی سید حسن شاہ محدث کے شاگرد تھے اور مولوی حسن شاہ مولانا عالم علی مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ مولانا حسن شاہ اور مولانا محمد شاہ کا تذکرہ "تذکرہ کاملان رامپور" "نزہۃ الخواطر" اور تراجم اہل حدیث میں ہے اور راقم السطور کا مفصل مضمون مولوی سید محمد شاہ پر "معارف" فروری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے۔

[۳] "تذکرۂ کاملان رامپور" صفحہ ۵۳

مولوی فاضل اور ۱۹۲۵ء میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔

اس کے بعد آپ نے مدرسہ رحمانیہ باڑہ ہندو راؤ میں مدرس کی حیثیت سے ملازمت حاصل کرلی اور اس کے چند سال بعد اینگلو عربک کالج دہلی میں فارسی کے ٹیچر ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد ملازمت چھوڑ کر رامپور آگئے اور رامپور میں اسٹیٹ ہائی اسکول میں عربی کے ٹیچر ہوگئے۔ کچھ دن بعد آپ کا تبادلہ رامپور کی مشہور درس گاہ مدرسہ عالیہ میں ہوگیا اور یہ سلسلہ ملازمت کے ریٹائرمنٹ تک چلتا رہا۔ دوران ملازمت چند مرتبہ عارضی طور پر پرنسپل بھی ہوئے اور جون ۱۹۵۴ء میں ۲۵ سال ۱۰ ماہ ملازمت کرنے کے بعد وائس پرنسپل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد مراد آباد کے مدرسہ امدادیہ میں تین سال مدرسی کے فرائض انجام دینے کے بعد لاہور چلے گئے اور لاہور میں جامعہ مدنیہ میں عارضی قیام کے دوران دو تین سال مدرس کے فرائض انجام دیے۔ گو آئندہ ملازمت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن مولانا محمد میاںؒ ناظم جمعیۃ العلماء ہند اور مفتی عتیق الرحمان صاحب کے اصرار پر آپ مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں مدرس و مفتی کے عہدہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہوگئے اور جب تک آنے جانے کی قوت رہی یہ سلسلہ جاری رہا اور اسی دوران جامعہ طبیہ میں بھی بطور مدرس کام کیا۔

آپ کا مذاق ابتدا سے ہی علمی رہا اور تصنیف و تالیف کا کام تقریباً پچاس سال مسلسل آپ کرتے رہے۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات کثیر ہیں۔ آپ کی تالیفات کی ابتدا، ترجموں سے ہوتی ہے۔ آپ نے "تجرید بخاری" کا ترجمہ اپنے طالب علمی کے زمانہ میں ہی شروع کر دیا تھا۔ جو "پیشوا" رسالے میں قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ۱۹۲۵ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے صحیح بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، مشکوٰۃ اور قرآن کریم کے ترجمے کیے۔ یہ ترجمے "مولوی" رسالے میں قسط وار ہر اشاعت میں شائع ہوتے تھے اور مکمل ہونے کے بعد عبدالحمید خاں نے محبوب المطابع سے کتابی شکل میں شائع کیے۔ یہ ترجمے عام فہم اور آسان زبان میں کیے گئے ہیں اور متن کے عین مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ بامحاورہ ہیں جس کی وجہ سے کافی مقبول ہوئے۔ ترجموں کے ساتھ ساتھ آپ کو قرآن کریم کی تفسیر کا بھی ذوق تھا اس لیے ۱۹۳۰ء سے آپ نے قرآن مجید کی تفسیر شروع کی جس کا نام "بیان السبحان" ہے۔ یہ تفسیر ۱۹۳۰ء سے ہی رسالہ "مولوی" میں شائع ہونا شروع ہوئی اور ۲۶ پاروں کی تفسیر قسط وار شائع ہوئی۔ اس کے بعد "مولوی" نے "بیان السبحان" مکمل

شائع کی اور پھر وسیم بکڈپو دیوبند نے بھی شائع کی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پاکستان کے کسی مطبع نے بھی "بیان السبحان" شائع کی ہے۔

آپ نے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی ۱۲۰۰ھ کی تصنیف "تفسیر مظہری" کا ترجمہ کیا۔ اصل تصنیف عربی زبان میں ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ تشریحی اور توضیحی نوٹ بھی لکھے ہیں جو بذاتِ خود ایک علیحدہ تصنیف ہیں۔ "تفسیر مظہری" کا ترجمہ "ندوۃ المصنّفین دہلی" نے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ مولانا کے عربی اور اردو زبان پر قادر الکلام ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔

مولانا کا ایک مفید کام لُغات القرآن کی تکمیل ہے جس کا تقریباً نصف حصہ یعنی ردیف الف سے عین تک مولانا عبدالرشید ندوی نے تالیف کیا تھا۔ مولانا جلالی نے غ سے ی تک پہنچا کر مکمل کر دیا۔ لغات القرآن کو بھی ندوۃ المصنّفین نے شائع کیا ہے۔ اس تصنیف میں قرآن کریم کے الفاظ کی شرح سہل اور آسان زبان میں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور و معروف تصنیف "غنیۃ الطالبین" کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

آپ نے ایک کتاب عقائد مسائل تصوف اور جملہ اسلامی تعلیمات پر مولانا نذیر الحق صاحب میرٹھی کے ساتھ مرتب کی تھی جو عرصہ ہوا شائع ہوئی تھی۔ سب سے پہلے ۱۹۲۲ء میں ایک رسالہ ماہانہ "عربی کا معلّم ادب" جاری کیا۔ اس کا دائرۂ اشاعت وسیع نہ تھا۔ چند ماہ بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایک دوسرا رسالہ "اتحادِ اسلامی" رام پور سے جاری کیا اور وہ بھی چند سال جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۴۳ء میں دوبارہ "اتحاد" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو دو سال چلا اور اس کے بعد آپ نے بند کر دیا۔ "عربی کا معلّم ادب" کتابی شکل میں جناب عزیز حسن بقائی مدیر "پیشوا" نے چھاپا۔

مولانا خاندانی طور پر سادات سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا سید جلال الدین بخاری کے خاندان سے تھے جس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔ علمائے کرام میں آپ سب سے زیادہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے متاثر تھے۔ اور ان کو مفکرِ اسلام مانتے تھے۔ احترام کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے۔ بہ اعتبار

---

لہ مولانا کی اہم تصنیف شعرائے عرب کا تذکرہ ہے جو چھپ نہیں سکا ہے اور مسودات کی شکل میں موجود ہے (اس پر اگر کوئی شخص کام کر سکے تو ایک اہم تصنیف عالم وجود میں آسکتی ہے)

5,775



Rampur

تحقیق کائنات و باعتبار نظامِ ہستی شیخ ابن عربی سے متاثر تھے۔

مذہبًا آپ حنفی تھے لیکن طبیعت کا میلان مسلک محدثین کی طرف تھا اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ میں نے آپ سے آپ کی تفسیر کے اصول کے متعلق معلوم کیا تو آپ نے فرمایا: "تفسیر قرآن بہ اعتبار سر اور حقیقت کے میرا موضوع ہے"، اور کہا کہ "میں خیر و شر کے فیصلے کے لیے عقل کو ناکافی سمجھتا ہوں بلکہ راستی کو اور غلطی کو بعض مسائل میں عقلی معیار پر جانچنے کا بھی مخالف ہوں۔ اس کے باوجود افکار اور اصول عقائدِ اسلامیہ اور اصولِ اعمالِ اسلامیہ کو عقل کے موافق پاتا ہوں۔ مبدأ اور اس کی تفصیل، معاد اور اس کی تشریح، برزخ اور اس کے احوال کو خلافِ عقل نہیں سمجھتا۔ اس کائنات کو بے حقیقت جاننے کے باوجود مظہرِ حقیقت جانتا ہوں۔"

"بحرِ قدم کی ارادی لہروں کا نام عالمِ حادث ہے۔ حق یا واقع یا وجود ذاتی متعدد نہیں۔ یہ کائنات تعدد اشکال، نیرنگیٔ اختلاف، مساحت، تفاوتِ مقدار اور طرح طرح کے تنوع کے باوجود ایک حقیقت رکھتی ہے جس کو ہم تقرر یا تقدر اعیانِ ثابتہ یا علم الٰہی کہہ سکتے ہیں۔"

"میرے نزدیک ثبوت ظہور فعلی سے مقدم ہے۔ بس یہ ساری کائنات باوجود موجود ہونے کے معدوم ہے یا باوجود معدوم ہونے کے موجود الاصل ہے۔ علم محیط، قدرتِ تامہ ارادہ مختار الوہیت کے ارکانِ ثلاثہ ہیں جو باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مخلوق میں ان ارکان میں سے کسی رُکن کا وجود نہ ذاتی ہے نہ عطائی۔"

اعمال کے متعلق سوال کرنے پر آپ نے فرمایا: "اعمال میرے نزدیک اجزائے ایمان نہیں۔ حقیقتِ ایمان سادہ اور بسیط کیفیت قلبی ہے۔ ہاں اجزائے تقویمی اور تحسینی ان کو کہہ سکتے ہیں اسی وجہ سے بے عمل ہونے کے باوجود حقیقتِ ایمانیہ سلب نہیں ہوتی۔"

مولانا باوجود اپنے علم و فضل کے نہایت سادہ مزاج اور ظریف الطبع تھے۔ ان کی گفتگو میں مزاح کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ علمی اور فلسفیانہ گفتگو کے دوران ان کی ذہانت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا تھا۔ بطور مدرس بھی وہ ایک کامیاب مدرس تھے۔ درسی کتابوں کے علاوہ بھی ہر کتاب کے پڑھانے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور طالب علم سے کبھی دریافت نہیں کرتے تھے کہ کون سی کتاب ہے۔

طالب علم جو کتاب لایا اور جو سبق اس نے شروع کیا اسی کو پڑھانا شروع کر دیتے تھے۔ بعض معاملات میں ایسی باتیں کہنے لگتے جو عام روش سے ہٹی ہوئی ہوتی تھیں اور سننے والا اس سے جز بز ہو جاتا تھا۔ گفتگو میں ہمیشہ سنجیدگی کا انداز ہوتا، علمی باتوں میں نہایت عمدہ نکات بیان کرتے، تنقید و تبصرہ میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ عام طور پر جذباتی انداز اختیار نہیں کرتے تھے۔ سائل کو ہر سوال کرنے کی اجازت دیتے خواہ وہ مذہب کے بنیادی اصولوں پر ضرب لگاتا ہو۔ سوال کتنا ہی پیچیدہ یا جارحانہ ہو اس پر غصہ نہ ہوتے اور عمدہ پیرایہ میں اس کو سمجھاتے۔ اگر کوئی نوجوان کسی اسلامی شعار پر کوئی تنقید کرتا تو اس کو عمدہ پیرایہ میں سمجھاتے اور اس کے شکوک و شبہات کو اچھے طریقے سے رفع کرتے اور ناگواری اور کبیدگی کا اظہار نہ کرتے۔ خاموش اور عقیدت سے سننے والوں کے کے مقابلہ میں معترض اور جرح کرنے والے طالب علموں سے زیادہ خوش ہوتے تھے۔ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں سے محبت و خلوص کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتے جس کی وجہ سے ہر چھوٹا ہر بات بے تکلفی سے دریافت کر لیتا تھا۔ تعصب اور تنگ نظری سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ذاتی زندگی میں سادگی، بے تکلفی تھی۔ شان و شوکت سے پرہیز کرتے تھے۔ بے علم لوگوں سے بھی محبت، خلوص اور برابری کے ساتھ پیش آتے، کسی کو مرعوب کرنے کی کسی طرح کوشش نہ کرتے۔

کھیلوں میں شطرنج کے شائق تھے۔ اچھا اور تیز کھیلتے تھے اور کھیل بلا کسی امتیاز کے سب کے ساتھ کھیلتے تھے۔ کسی معاملہ میں نہ اپنے مرتبے کا خیال کرتے، نہ اپنے مرتبے کو اہمیت دیتے۔

ساٹھ سال تک علم و ادب کی خدمت کرنے کے بعد اور تالیفی اور تصنیفی زندگی گزارنے کے بعد ۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو بمقام دہلی انتقال ہوا اور دہلی گیٹ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ دو لڑکے ڈاکٹر نجم السلام اور ضیاء السلام اور تین لڑکیاں سلمیٰ بی، مسلمہ بی، ساجدہ بی اور ایک بیوہ چھوڑیں۔ لڑکے نہایت ذہین ہیں اور ذہانت اور محنت میں اپنے والد کے جانشیں ہیں۔ ڈاکٹر نجم السلام مٹیا محل دہلی میں مدرسہ و مسجد حسین بخش کے برابر مطب کرتے ہیں۔